POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24-25 March 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87واں سال

Date of Publication: 23-03-2026 • Price: 5/- • 1-7 April 2026 • Issue: 13 • Vol:85

یکم تا ۷/اپریل ۲۰۲۶ء • شمارہ:۱۳ • جلد:۸۵

# گلدستوں کی اشاعت میں سخنورانِ اعظم گڑھ کا حصّہ

محمد الیاس الاعظمی

انیسویں صدی کے ربعِ آخر میں مشاعروں اورشعری محفلوں میں باقاعدہ مصرعِ طرح دیے جانے لگے تھے اور شعرا ان پر طبع آزمائی کرنے لگے تھے۔ ایک طرحی محفل میں جو اگست 1852 میں دہلی میں منعقد ہوئی تھی، مرزا غالب (1797-1869) کے بھی غزل سنانے کا ذکر ملتا ہے۔ ان کا یہ مشہور شعر اسی غزل کا ہے جو انھوں نے طرحی مشاعرے میں پیش کی تھی:

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

ان طرحی محفلوں سے اردو شاعری میں ایک انقلاب آیا اور طرحی غزلوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ غیر طرحی غزلوں کے ساتھ طرحی غزلیں بھی اخبارات ورسائل کی زینت بننے لگیں۔ پھر ان کی اشاعت کے لیے گلدستوں کی اشاعت کا رواج ہوا اور لکھنؤ، دہلی، میرٹھ، مرادآباد، بدایوں، آگرہ، مارہرہ، شاہ جہاں پور، پٹنہ، کلکتہ، مالیگاؤں، بمبئی، حیدرآباد اور ملک کے بعض دوسرے خطوں اور دبستانوں سے کثرت سے گلدستے شائع ہونے لگے۔ شعرا نے ان گلدستوں سے خاصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور ان کی قیمتی تخلیقات ان میں بڑے اہتمام سے شائع ہوئیں۔

گلدستوں کے آغاز کا سہرا 'تاریخِ صحافت اردو' کے مصنف مولانا امداد صابری کی تحقیق کے مطابق مولوی کریم الدین پانی پتی کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے 1845 میں دہلی سے گلدستہ 'گلِ رعنا' شائع کیا۔ ان کی اسی فضیلت اور اہمیت کے سبب امداد صابری نے اپنی کتاب 'گلدستۂ صحافت' کا انتساب ان کے نام کیا ہے اور لکھا ہے:

''میں گلدستہ صحافت کو جناب مولوی کریم الدین پانی پتی کے نام نامی سے معنون کرتا ہوں جو ہندوستان میں گلدستوں کے موجد تھے، انھوں نے اپنا پہلا گلدستہ 'گلِ رعنا' دہلی سے 1845 میں جاری کیا۔

گلدستہ 'گلِ رعنا' کے جاری ہونے کے بعد ہندوستان میں گلدستوں کا جال بچھ گیا، چناں چہ ہر صوبہ، ہر ضلع اور ہر شہر سے گلدستے نکلنے لگے۔ شعرا کی جان میں جان آئی، شعرا کے کلام کی اشاعت ہونے لگی اور ان کی قابلیت کے ڈنکے بجنے لگے۔

ان گلدستوں میں عروضی وادبی بحثیں اور تنقیدی مضامین بھی اشاعت پانے لگے، چناں چہ ان شعرا کے آرٹکلوں اور ترجمانوں نے اردو ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔

اگر جناب مولوی کریم الدین صاحب کی ذہانت و فراست یہ کام نہ کرتی اور گلدستہ 'گلِ رعنا' نہ جاری فرماتے تو یہ ایک اہم وضروری کام شروع نہ ہوتا۔ اردو کے بہی خواہوں کو مولوی کریم الدین صاحب کا ممنون ہونا چاہیے، تاریخ اور ادب میں ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہے گا۔''

مولانا امداد صابری نے اپنی کتاب 'گلدستۂ صحافت' 1983 میں لکھی جو 1984 میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے سو کے قریب گلدستوں کا تعارف اور ان کے مشمولات کا ذکر کیا ہے۔ اس میں گلدستوں کے سرپرستوں، مالکوں اور مدیروں کا تذکرہ بھی انھوں نے سپردِ قلم کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق گلدستوں کے تعارف پر یہ پہلی باقاعدہ، معلومات افزا اور بھرپور کتاب ہے۔ خاص طور پر اس کتاب کا مفصل مقدمہ مصنف کی سخت محنت، تلاش وتفحص اور دیدہ ریزی کا آئینہ دار ہے، مگر سچ تو یہ ہے کہ گلدستوں کی جانب سب سے پہلے رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی (1875-1951) نے توجہ دی اور 'اردو زبان کے قدیم گلدستے' کے عنوان سے ماہنامہ 'اردوے معلیٰ' کانپور، ستمبر 1911 میں ایک سلسلۂ مضامین لکھا جو بالاقساط شائع ہوا۔ اس سلسلۂ مضامین میں 18 گلدستوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ نیز ان کے انتخابات بھی شائع کئے گئے ہیں۔ ان گلدستوں کے نام یہ ہیں:

| | | |
|---|---|---|
| -1 | گلدستہ شعرا، لکھنؤ | 1874 |
| -2 | گل کدہ ریاض خیرآباد | 1879 |
| -3 | نتیجہ سخن لکھنؤ | 1883 |
| -4 | پیام یار لکھنؤ | 1883 |
| -5 | تحفہ عشاق | 1884 |
| -6 | کرشمہ دلبر، خیرآباد | 1885 |
| -7 | ریاضِ سخن، مرادآباد | 1885 |
| -8 | دامن گل چیں، لکھنؤ | 1885 |
| -9 | فتنہ وعطر فتنہ | 1885 |
| -10 | نغمہ بہار، لکھنؤ | 1886 |
| -11 | گلدستہ کیف، اناو | 1889 |
| -12 | دامن بہار آگرہ | 1892 |
| -13 | گل چیں لکھنؤ | 1892 |
| -14 | انتخاب، لکھنؤ | 1893 |
| -15 | تصویر عالم | 1896 |
| -16 | ریاض سخن مارہرہ | 1896 |
| -17 | خدنگ نظر لکھنؤ | 1897 |
| -18 | معیار لکھنؤ | 1898 |

مولانا حسرت موہانی نے ان گلدستوں کا بڑی گہرائی سے مطالعہ و جائزہ لیا اور قارئینِ 'اردوے معلیٰ' کی خدمت میں پیش کیا اور ان کی ادبی اہمیت وافادیت بھی واضح کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کے ارتقا میں ان گلدستوں کا بڑا اہم حصہ ہے۔ تاریخ ادب اردو پر لکھتے ہوئے ان کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر لکھنے والوں نے علی العموم ان گلدستوں سے تعارض نہیں کیا ہے۔ اس سے ہماری اردو شاعری کا ایک انتہائی اہم پہلو مستور رہ گیا۔

بہرحال ان گلدستوں نے اردو شعر وادب کی ترقی کے لیے ایک نیا ماحول سازگار کیا، چناں چہ اس عہد کے تمام بڑے بڑے نامور اور قدآور شعرا کے کلام کے ساتھ نوآموز شعرا کا کلام ان گلدستوں کی زینت بنا۔ راقم الحروف کی نظر سے میرؔ وغالبؔ اور ان کے تلامذہ، نیز داغؔ و امیرؔ، امیر اللہ تسلیمؔ، ظہیرؔ دہلوی، جلالؔ لکھنوی، نوحؔ ناروی، میر مہدی مجروح وغیرہ متعدد نامور شعرا کی غزلیں ان گلدستوں میں گزری ہیں، بعد کے جدید شعرا میں مولانا حالی، اقبال، حسرت موہانی، ریاض خیرآبادی، افقر موہانی، محمد یوسف رنجور عظیم آبادی، شاد میرٹھی، عزیز لکھنوی، حامد علی حامد رامپوری، عبدالحلیم شرر، ظفر علی خاں، محمد یٰسین آہ، ابوالکلام آزاد، حفیظ جونپوری، بیدل، جوش کے ساتھ، تجمل حسین جلال

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

پوری، نواب میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد دکن، مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم حیدرآباد دکن، صفدر مرزا پوری، عبدالاحد شمشاد لکھنوی اور تلوک چند محروم وغیرہ کے علاوہ سیکڑوں شعرا کا کلام ان گلدستوں کی زینت بنا دیکھا ہے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ان گلدستوں میں اعظم گڑھ کے متعدد شعرا کا کلام بھی شائع ہوا ہے۔ گویا اس دور کی اردو شاعری کی ترقی میں شعرائے اعظم گڑھ نے بھی حصہ لیا، مگر اعظم گڑھ کے شعرا کی شاعری کے اس منظر نامے سے ادبی دنیا بالخصوص اعظم گڑھ کے ادبا و شعرا غالباً سرے سے ناواقف ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اب تک کسی اہلِ قلم نے ان کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ ناچیز نے اعظم گڑھ کے اس شعری منظر نامے کی مرقع آرائی کے لیے جب ان گلدستوں کی تلاش شروع کی تو بلا مبالغہ سیکڑوں گلدستے ہاتھ آئے لیکن افسوس کہ کسی گلدستے کی مکمل فائل کہیں دستیاب نہیں ہوئی۔ آج ہم جب اپنی ترقیات اور بلندیوں کا ذکر کرتے ہیں تو اپنا سلسلہ عہد گذشتہ کی ترقیوں سے ملا دیتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک ہمیں سلیقے سے کتب و رسائل کا تحفظ بھی نہیں آیا۔ چناں چہ اس مضمون میں ہر گلدستے کے محض متفرق شماروں پر اکتفا کرنا پڑا ہے، اس لیے اس کو موضوع کے لحاظ سے مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن جو سرمایہ ہاتھ آ گیا ہے وہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اعظم گڑھ کے سخنوروں نے اپنی بساط بھر ہر دور میں شعر و ادب کی خدمت جی لگا کر کی۔

ناچیز نے اعظم گڑھ کے شعرا کا کلام جمع کرنے کے لیے بلا مبالغہ پچاسوں گلدستوں کے سیکڑوں شماروں کا ایک ایک ورق دیکھا اور جہاں تک ممکن تھا تلاش و تفحص اور تحقیق و تفتیش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ البتہ مسلسل محنت اور تلاش و جستجو کی تمام تر دشواریوں کے برداشت کرنے کے باوجود خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی، جن گلدستوں میں شعرائے اعظم گڑھ کا کلام شائع ہوا ہے، ان کے نام یہ ہیں: آفتاب بمبئی، ارمغان ہردوئی، افتخار جاورہ، القمر مرادآباد، انتخاب سخن مالیگاؤں، باغِ سخن میرٹھ، پیامِ یار لکھنؤ، جلوۂ یار میرٹھ، خدنگِ نظر لکھنؤ، دامنِ گل چیں لکھنؤ، ریاضِ سخن لاہور، سفینۂ نجات دہلی، شاہد مضراب مرادآباد، غنچۂ جاوید بمبئی، فصیح الملک مارہرہ، گلبن سخن بھوپال، گلدستہ دامن بہار آگرہ، گل چیں لکھنؤ، گلدستۂ سخن، گلدستہ نعت بمبئی، گلستانِ سخن رنگون، ماہنامہ محبوب الکلام حیدرآباد اور ماہنامہ نیرنگ رام پور وغیرہ۔

تقریباً تمام گلدستوں کے سرورق پر ایک معنی خیز شعر درج ہے۔ ان گلدستوں میں یہ بات بھی مشترک ہے کہ ان میں شعرا کی طرحی اور غیر طرحی ہر طرح کی غزلیں شائع ہوئی ہیں، تاہم اپنے مشمولات کے لحاظ سے یہ گلدستے کسی قدر مختلف بھی ہیں۔ مثلاً:

1- جو غزلیں شائع ہوئی ہیں ان کی ترتیب کسی گلدستے میں تخلص کے لحاظ سے ہے اور کسی میں شعرا کے ناموں کے لحاظ سے۔

2- غزلوں کے ساتھ موضوعاتی نظمیں، قطعات و رباعیات اور مسدس وغیرہ بھی شائع ہوئے ہیں

3- غزلوں کے ساتھ ادبی و تنقیدی مضامین اور تبصراتی خطوط و مراسلات بھی ان میں شامل ہیں، ان میں خاص طور پر شعر و شاعری کے رموز و آداب، قافیہ و ردیف اور عروضی مباحث کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔

4- بعض گلدستوں میں نثری تحریں زیادہ شائع ہوئی ہیں۔ البتہ حصہ نظم میں طرحی اور غیر طرحی غزلیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔

متعدد گلدستے اصنافِ سخن اور بہ اعتبار موضوعات بھی شائع ہوئے ہیں۔ مثلاً گلدستۂ حمد و ثنا اور مناجات، گلدستۂ نعت و سلام، گلدستۂ قومی و ملی منظومات، گلدستۂ ادب اردو، گلدستہ قوالی اور گلدستۂ عید وغیرہ۔ ان کے علاوہ اردو کے ذخیرے میں گلدستوں کی ایک قسم مشاعروں کی روداد وں اور اس میں شامل کلام پر مشتمل ہوتی ہے۔ ناچیز نے اولاً یہ عزم مصمم کیا تھا کہ خالص گلدستوں کے سوا دوسرے گلدستوں سے تعارض نہیں کرے گا مگر مشاعروں کے بعض گلدستوں کی افادیت کے پیشِ نظر اس اصول سے دست بردار ہونا پڑا ہے۔ مثلاً رنگون برما سے شائع 'گلستانِ سخن' اور اعظم گڑھ میں مرزا احسان احمد کی یاد میں شائع ہونے والے گلدستے کو اس لیے شامل کرنا پڑا کہ ان میں اعظم گڑھ کے چند ایسے شعرا کا کلام شامل ہے جن کا ذکر اور کہیں نہیں ملتا ہے اور نہ کہیں اور ملنے کی توقع ہی کی سکتی ہے۔ چناں چہ ان شعرا کا نادر کلام اس مجموعے کا بڑا قیمتی حصہ ہے۔ اسی طرح گلدستہ نعت میں اعظم گڑھ کے شعرا کی چند نعتیں شامل ہیں۔ ان میں ایک اقبال احمد سہیل کی مشہورِ زمانہ نعت 'موج کوثر' بھی ہے۔

اہمیت کے پیش نظر ان گلدستوں کا اجمالی تعارف اور ان کے مشمولات کا ذکر و جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مولانا حسرت موہانی کے بعد کسی نے اب تک ان کا تعارف و تجزیہ غالباً پیش نہیں کیا۔ ہاں ڈاکٹر صاحب علی مرحوم سابق صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی نے 'پیام یار' لکھنؤ پر ایم فل کا مقالہ لکھا ہے اور اس میں گلدستوں کی روایت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور قدیم گلدستوں کی ایک فہرست بھی درج کی ہے مگر وہ فہرست امداد صابری مرحوم کی فہرست میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتی۔ طوالت کے خوف سے یہاں صرف ان گلدستوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے جس میں شعرائے اعظم گڑھ کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔

○ آفتاب (بمبئی)

یہ ماہانہ گلدستہ عروس البلاد بمبئی کے عطاری محلّہ، مغلئی حکیم کے دواخانہ سے ہر ماہ قمری کی پہلی تاریخ کو نکلتا تھا۔ اس کے مالک حکیم عبدالمجید تجید سورتی تھے۔ بمبئی اور قرب و جوار کے شعرا کا کلام کثرت سے شائع ہوا ہے، اور بے حد پسندیدہ گلدستہ تھا۔ اس کے سرورق پر یہ اشعار لکھے ہوئے ہیں:

بازار سرد ہے مہِ کنعاں کا ان دنوں
سکے پڑے ہوئے ہیں مرے آفتاب کے
ایسا ہے خاکسار زمانے میں آفتاب
حاسد کے اعتراض کا دیتا نہیں جواب

○ ارمغان (ہردوئی)

یہ ماہانہ گلدستہ ہردوئی (اتر پردیش) سے نکلتا تھا۔ اس کے مہتمم نامور شاعر ابوالاعجاز محمد احسان علی خاں احسان شاہ جہاں پوری اور مرتب اشرف صبوحی تھے۔ اس میں اس دور کے متعدد نامور شعرا کی تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ مہتمم کے علاوہ داغ دہلوی، صغیر گورکھپوری، امیر مینائی، مختار شاہ جہاں پوری، مطیر محمد آبادی کے نام شامل ہیں۔ اس کے ورق پر یہ شعر درج ہے:

وہ گل چیں ہیں کہ ہم باغ سخن سے پھول چن چن کر
بنایا کرتے ہیں گلدستہ گل رویوں کی محفل کا

○ افتخار (جاورہ)

ہز ہائینس نواب سر محمد افتخار علی خاں صولت جنگ فرمانروائے ریاست جاورہ کو خطاب ملنے کی یادگار میں ماہنامہ افتخار جاری ہوا۔ اسے اپنے عہد کے جاورہ کے نامور شاعر حضرت بیدلؔ نکالتے تھے۔ محمد لطف علی خاں سہیلؔ کو بیدلؔ سے شرف تلمذ حاصل تھا اور وہ بھی ریاست جاورہ ہی کے رہنے والے تھے اور سرکاری مطبع میں منصرم طباعت تھے۔ یہ ماہنامہ کب جاری ہوا اور کب تک جاری رہا اس کی تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا۔ اس میں اعظم گڑھ کے اس دور کے بعض شعرا کا کلام شائع ہوا ہے۔

نومبر 1914 کے شمارے میں علامہ شبلی کی وفات پر سیّد ابن علی محشرؔ کا قطعۂ تاریخ وفات بھی شائع ہوا ہے۔ سیّد ابن علی محشرؔ بھی ریاست جاورہ ہی کے رہنے والے تھے اور ایک پختہ مشق شاعر تھے۔

○ القمر (مرادآباد)

ماہنامہ 'القمر' مرادآباد سے ابوالقیام آثرؔ کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ سراج الحق قمرؔ مرادآبادی اس کے مدیر و مہتمم تھے۔ مصور حسین امروہوی اور احسان الحق انصاری اس کے معاون مرتب تھے۔ اس میں اردو کے اس عہد کے تمام بڑے بڑے نامور شعرا کا کلام بالخصوص غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ اسی سے مرزا مشتاق احمد بیگ نادانؔ اعظم گڑھی کی ایک غزل دستیاب ہوئی ہے۔ بعض مجموعہ ہائے کلام میں ان کا نام نظر سے ضرور گزرا ہے، مگر افسوس نادان اعظم گڑھی کے بارے میں اور کسی قسم کی معلومات نہیں مل سکیں۔ نہ ان کی تاریخِ پیدائش و وفات معلوم ہوئی اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کس مقام کے رہنے والے تھے اور کب ہجرت کی۔

○ باغِ سخن (میرٹھ)

باغِ سخن شہر میرٹھ سے شائع ہوتا تھا اور ماہانہ گلدستہ تھا۔ محمد نظام علی خاں نظامی اور شمس الدین شمس اس کے مالک و مہتمم اور مدیر تھے۔ نورالانوار پریس میرٹھ میں طبع ہوتا تھا۔ اس دور کے گلدستوں میں اسے ایک اہم مقام اس لیے حاصل تھا کہ اس میں اپنے وقت کے نامی شعرا نے اپنا کلام شائع کرایا ہے۔ راقم کو 'باغِ سخن' میرٹھ کے محض دو ہی شمارے دستیاب ہوئے۔ اس میں کئی شعرائے اعظم گڑھ کی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ سرورق پر یہ شعر درج ہے:

بری ہے داغ سے یہ لالہ زار باغِ سخن
غم خزاں نہیں رکھتی بہار باغِ سخن

○ جلوۂ یار (میرٹھ)

یہ ماہانہ گلدستہ بھی شہر میرٹھ سے منشی محمد اکبر خاں اکبر وارثی اور منشی محمد برکت شیر خاں ادیب کی سرپرستی اور شریف خاں آزادؔ مالک و مہتمم کی ادارت میں نکلتا تھا۔ شمس المطابع میرٹھ میں طبع ہوتا تھا اور بے حد مقبول تھا۔ اس کے سرورق پر دو شعر درج ہوتے تھے۔ جو درج ذیل ہیں:

نہیں معلوم دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے مجلس کی

طور پر حضرت موسیٰ جو گرے غش کھا کر
جلوۂ یار پکارا ابھی دیکھا کیا ہے

اس میں عابد حسن عابد فریدی، مولوی محمد غلام عباس مبارکپوری، طریق جون پوری، سید عبدالغفور عاشق، منشی عبدالرحمٰن ثابت اعظم گڑھی اور اس کے مہتمم حکیم عبدالمجید تجید وغیرہ کا کلام راقم کی نظر سے گزرا ہے۔

○ دامنِ گل چیں (لکھنؤ)

'دامنِ گل چیں' ایک ماہنامہ گلدستہ تھا۔ فروری 1885 میں محلّہ کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ سے تاجدارِ سخن امیر مینائی کی سرپرستی میں جاری ہوا۔ اس کے مالک ان کے بڑے صاحبزادے محمد احمد قمرؔ تھے اور مہتمم شیخ واجد علی بسملؔ تھے جو ایک اچھے شاعر تھے۔ اصح المطابع لکھنؤ میں چھپتا تھا۔ بند ہونے کے بعد 1898 میں دوبارہ امیر مینائی کے دوسرے فرزند اخترؔ مینائی نے بڑے اہتمام سے جاری کیا۔ اس میں بھی اہم شعرا داد سخن دیتے تھے اور یہ بہت پسند کیا جاتا تھا۔ اس کے گیارہ شمارے ریختہ فاؤنڈیشن کی لائبریری میں ملے اور اسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے سرورق پر یہ شعر مستقل چھپتا تھا:

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول
پھول میں نے کچھ چنے ہیں ان کے دامن کے لیے

○ ریاضِ سخن (لاہور)

اس کے مرتب دیوان پنڈت رادھے ناتھ کول متخلص بہ گلشنؔ رئیس لاہور ہیں۔ یہ گلدستہ 1934 میں لاہور سے (...بقیہ صفحہ 6 پر)

# فورٹ ولیم کالج کی اُردو خدمات کے مثبت و منفی پہلو

عارف عزیز

اُردو زبان وادب کے فروغ میں مختلف دبستانوں، اداروں، درس گاہوں اور تحریکوں کی نمایاں خدمات رہی ہیں، جن میں ایک اہم نام فورٹ ولیم کالج کا بھی ہے، جو کلکتہ میں 10 جولائی 1800 کو انگریز گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے سیاسی حکمتِ عملی کے تحت قائم کیا تھا، لیکن اِس کے گہرے، مثبت اور منفی اثرات اُردو ادب کی تاریخ بالخصوص نثری ادب کی اصلاح و ترقی میں مرتب ہوئے۔ یہ کالج متحدہ ہندستان کی سرزمین پر، مغربی طرز کا پہلا تعلیمی ادارہ تھا جس کے کئی مقاصد تھے۔

لارڈ ولزلی ایک ذہین اور فطین انگریز افسر تھے، جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا استعمال ہندستان میں انگریزوں کے قدم جمانے میں کیا، وہ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ذریعے کئی مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پہلا مقصد تھا جو نئے ملازمین ایسٹ انڈیا کمپنی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے انگلستان سے ہندستان آتے ہیں، اُن کی تربیت کرکے کام کرنے کے لائق بنانا، جس کے دو پہلو تھے ایک علمی قابلیت میں مناسب اضافہ کرنا، دوسرا اُن کو ہندستانیوں کے مزاج، اُن کی زبان، عادات و اطوار اور طور طریقوں سے واقف کرانا۔ لارڈ ولزلی نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اگر انگریزوں کو ایک اجنبی ملک پر حکومت کرنا ہے تو اُنھیں کمپنی کے ملازموں کو مقامی زبانوں کو سکھانے کے ساتھ یہاں کے ماحول سے واقفیت کے لیے تعلیم و تربیت کا کارگر نظام قائم کرنا چاہیے، اس کے لیے اُنھوں نے انگریز اعلا حکام تک اپنی تجاویز پہنچائیں، جس کے نتیجے میں کالج کے قیام کی راہ ہموار ہوئی اور جان گلکرسٹ جو ہندستانی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے، کمپنی کے ملازمین کی درس و تدریس کے لیے تیار ہوگئے۔

لارڈ ولزلی چاہتے تھے کہ اُن کی کوششیں زیادہ سے زیادہ بارآور ہوں، اِس کے لیے اُنھوں نے یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ کسی بھی انگریز کو اُس وقت تک بنگال، اُڑیسہ اور بنارس میں اہم عہدے پر فائز نہیں کیا جائے، جب تک وہ تمام قوانین وضوابط کے ساتھ مقامی زبانوں کی واقفیت کا امتحان نہ پاس کرلے۔ اِس میں اُردو سکھانے پر سب سے زیادہ توجہ اِس لیے دی گئی کہ یہ زبان اُس وقت ہندستان گیر حیثیت و مقبولیت حاصل کرچکی تھی، جس کا احساس ولزلی اور جان گلکرسٹ کو تھا، اِس لیے وہ ہندستان میں برطانوی مفادات محفوظ اور انگریز حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ کالج کا عملہ اُردو جیسی عوامی زبان کو جانے ہی نہیں باضابطہ طور پر اُس کے سمجھنے، بولنے اور لکھنے کی مہارت بھی پیدا کرے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اپنے ایک خطبے میں اِس پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے وقت اُردو زبان نوخیز ہونے کے باوجود لاکھوں ہندستانیوں کی ناگزیر ضرورت بن چکی تھی، جس کے بغیر نہ مال گزاری نظام کو سمجھا جاسکتا تھا، نہ عدلیہ کی کارروائی کو اور نہ صنعت وحرفت کے کا تقاضوں کو سمجھ کر پورا کیا جاسکتا تھا، اِسی لیے نئے حکمرانوں نے اپنے مفادات کا لحاظ کرکے اُردو کی ترقی واستحکام کو پیشِ نظر رکھا، جو اُن کی گہری نظر اور صحیح منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا، اِس کے ذریعہ وہ ہندستان میں اپنا حلقۂ اثر وسیع کرتے رہے، یہاں تک کہ فرانسیسی اور پُرتگیزی حملہ آواروں پر بھی انہوں برتری حاصل کرلی۔

اُس وقت ہندستان میں فارسی زبان کی حکمرانی تھی، سنسکرت بھی ایک مخصوص طبقے کی زبان تھی لیکن کاروبار اور عوام کی زبان اُردو بن گئی تھی، مغل شہنشاہ شاہ عالم نے ضرور انگریزوں کے سامنے خودسپردگی کرکے بہار اور بنگال کی مال گزاری وصول کرنے کا کام ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کردیا تھا، اِسی لیے نووارد انگریزوں کو اُردو یا ہندستانی زبان سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوگیا تھا، جس کو پورا کرنے کے لیے فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ انگریز اہل کاروں کو اُردو زبان کا استعمال کرکے کاروبارِ حکومت چلانے میں آسانی ہو اور سول معاملات سلجھانے میں بھی وہ پریشان نہ ہوں۔

فارسی کے بجائے اُردو کو اپنانے کا دوسرا مقصد اُس زبان کے گلے پر چھری پھیرنا تھا جو ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی نمائندہ تھی، سرکار، دربار، میلے ٹھیلوں میں اُس سے رونق تھی، اُس کی شیرینی، تروتازگی، ہمہ گیری اور دلکشی کے آگے دوسری زبانوں کا چراغ نہیں جلتا تھا، اِس کے تعلیمی وتہذیبی ادارے ملک کے چپہ چپہ پر قائم تھے، ہندو مسلمانوں کے بچے جو کتابیں پڑھتے تھے، وہ اخلاقی محاسن، تہذیبی نکات اور فکری پاکیزگی سے نہ صرف بھری ہوئی تھیں بلکہ اخلاقی و تہذیبی برتری کی ایسی علمبردار تھیں کہ ہندستان کے باشندے عرصۂ دراز تک انگریزوں کی فکری یلغار اور تہذیبی چمک دمک سے مرعوب نہ ہوسکے اور فوجی وعسکری سطح پر شکست کھانے کے باوجود انگریزوں کی تہذیب وکلچر کے آگے خودسپردگی پر آمادہ نہ ہوئے۔ اُس وقت انگریزوں کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ اُس زبان کو ختم کرنے کی فکر پہلے کریں، جو اِس ذہنی برتری کا سرچشمہ ہے، اِس میں یہ بھی مقصد شامل تھا کہ ہندستان کے تہذیبی رشتے کو باقی دنیا سے کاٹ دیں کیوں کہ فارسی کی بدولت ہندستان کا رشتہ افغانستان اور اُس سے آگے ایران، ماوراء النہر یعنی بخارا، سمرقند، تاشقند اور آزربائیجان تک براہِ راست قائم تھا۔

انگریز ہندستان کی تاریخ اور اُس کی تقدیر پر افغانستان کے اثرات سے بخوبی واقف تھے، اُنھیں یہ بھی معلوم تھا کہ افغانستان کی حکومت ہندستان میں انگریزی اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، جس کی ایک مثال مولانا برکت اللہ بھوپالی کی کوشش سے کابل میں بننے والی 'جلاوطن' حکومت ہے، اِسی لیے انگریز فارسی اور اُس سے وابستہ تہذیب کو مٹا دینا چاہتے تھے، فورٹ ولیم کالج کے ذریعے دیسی زبانوں کو ترقی دے کر اُنھوں نے یہ کام اِس مہارت سے انجام دیا کہ آج ڈھونڈنے سے فارسی جاننے والا ملک میں نہیں ملتا اور وہ وقت آگیا ہے کہ ہندستان میں فارسی ایک اجنبی و بیرونی زبان کی حیثیت تک پہنچ گئی ہے، یقیناً یہ ایک ایسا نقصانِ عظیم ہے کہ جس کی تلافی محال ہے۔

جہاں تک فورٹ ولیم کالج کی تحریک سے قبل ہندستان میں اُردو نثر کی کیا حالت تھی اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک نثر میں خاطرخواہ ترقی نہیں ہوئی تھی، عبارت مقفّیٰ اور مسجع لکھی جاتی تھی اور بوجھل ومشکل الفاظ کا استعمال عام تھا۔ کالج کے نثر نگار بالخصوص میر امّن دہلوی نے جو فورٹ ولیم کالج کے پروردہ تھے، سب سے پہلے اپنی کتاب 'باغ وبہار' میں زبان کی سادگی، سلاست اور روزمرہ کے محاوروں کا استعمال کیا، جس سے کالج کے دوسرے لکھنے والوں کو بھی تحریک ملی اور اُردو کی ہیئت تبدیل ہونے لگی۔ اِس لیے یہ کہنا برحق ہے کہ کالج کی مساعیِ جمیلہ سے اُردو نثر میں سادگی وسلاست عام ہوئی اور اُردو کا دامن وسیع ہونے لگا، جس کا سہرا ڈاکٹر گلکرسٹ کے سر بندھتا ہے، جنھوں نے خود بھی متعدد کتابیں لکھیں اور کالج کے ملازمین سے بھی لکھوائیں، اِس طرح اُنھیں اُردو نثر کے اِس نئے عہد کا روحِ رواں قرار دیا جاسکتا ہے، جس کا کریڈٹ فورٹ ولیم کالج کے منصوبے کو جاتا ہے، یہ اگر بروئے کار نہیں آتا تو اردو نثر کی برق رفتاری سے نہ ترقی ہوتی، نہ آج ہم اس کا موجودہ ترقی یافتہ حالت میں مطالعہ کرنے کے قابل ہوتے۔

> فورٹ ولیم کالج کی تحریک سے قبل ہندستان میں اُردو نثر کی کیا حالت تھی اِس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک نثر میں خاطرخواہ ترقی نہیں ہوئی تھی، عبارت مقفّیٰ اور مسجع لکھی جاتی تھی اور بوجھل ومشکل الفاظ کا استعمال عام تھا۔ کالج کے نثر نگار بالخصوص میر امّن دہلوی نے جو فورٹ ولیم کالج کے پروردہ تھے، سب سے پہلے اپنی کتاب 'باغ وبہار' میں زبان کی سادگی، سلاست اور روزمرہ کے محاوروں کا استعمال کیا، جس سے کالج کے دوسرے لکھنے والوں کو بھی تحریک ملی اور اُردو کی ہیئت تبدیل ہونے لگی۔ اِس لیے یہ کہنا برحق ہے کہ کالج کی مساعیِ جمیلہ سے اُردو نثر میں سادگی وسلاست عام ہوئی اور اُردو کا دامن وسیع ہونے لگا، جس کا سہرا ڈاکٹر گلکرسٹ کے سر بندھتا ہے، جنھوں نے خود بھی متعدد کتابیں لکھیں اور کالج کے ملازمین سے بھی لکھوائیں، اِس طرح اُنھیں اُردو نثر کے اِس نئے عہد کا روحِ رواں قرار دیا جاسکتا ہے، جس کا کریڈٹ فورٹ ولیم کالج کے منصوبے کو جاتا ہے، یہ اگر بروئے کار نہیں آتا تو اردو نثر کی برق رفتاری سے نہ ترقی ہوتی، نہ آج ہم اس کا موجودہ ترقی یافتہ حالت میں مطالعہ کرنے کے قابل ہوتے۔

ایڈیٹر روزنامہ 'ندیم' بھوپال
Mob. 09425673760
E-mail : arifazizBPL@rediffmail.com

# اردو دُنیا

## آنند نرائن ملاّ: فن اور شخصیت پر یوپی پریس کلب لکھنؤ میں سمینار کا انعقاد

لکھنؤ (24 مارچ)۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں جن بلند پایہ شاعروں نے چمنِ اُردو کی آبیاری کی ہے، اُن میں آنند نرائن ملاّ کا نام سرِ فہرست ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور مصلحِ ادب اور قوم بھی۔ آنند نرائن ملاّ دبستانِ لکھنؤ کی آبرو نہیں بلکہ دبستانِ اُردو کی آبرو ہیں۔ وہ آخری وقت تک اردو کے گیسو سنوارتے رہے۔ اردو شاعری میں ان کی طرزِ ادا اُن کے ذہن وفکر کی غماز ہے۔ اُن کی شاعری نئے تقاضوں سے بہرہ ور ہے۔ آنند نرائن ملاّ مصلحِ ادب اور محبِّ وطن شاعر ہیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار اودھ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام اور اتر پردیش اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے منعقدہ سمینار 'آنند نرائن ملاّ: فن اور شخصیت' یوپی پریس کلب میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر احتشام احمد خاں نے کیا۔ سمینار کی نظامت اپنے مخصوص انداز میں ڈاکٹر سیما صدیقی نے کی اور مہمانوں اور مقالہ نگاروں کا تعارف ان کے شایانِ شان نہایت خوب صورت طریقے سے کرایا۔ سمینار کے آغاز میں سمینار کی کنوینر اور اودھ ویلفیئر فاؤنڈیشن کی صدر صبیحہ سلطانہ نے افتتاحی کلمات ادا کیے اور سوسائٹی کے اغراض و مقاصد بیان کیے، ساتھ ہی صبیحہ سلطانہ اور شفق نے مہمانوں کا شال اور گلدستوں سے استقبال کیا اور مہمانوں کو تحائف دے کر ان کی عزت افزائی کی۔ صدرِ جلسہ فدا حسین انصاری (سابق چیئرمین یوپی ہائر ایجوکیشن سروس کمیشن) نے صدارتی خطاب میں کہا کہ ملاّ کے نزدیک زندگی فقط انسان کی آسودگی اور لذت پرستی نہیں ہے، ان کے یہاں تمام انسانوں کے مسائل اور پریشانی کو اپنی خوشیوں پر مقدم رکھنے کا نام زندگی ہے۔ مہمانِ ذی وقار انیس منصوری (سابق ریاستی وزیر) نے کہا کہ ملاّ کے یہاں سماجی صورتِ حال اور وطنِ عزیز کا درد اتنا شدید ہے کہ اکثر غزلوں میں اس کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ملاّ نے ظلم و بربریت کی تصویریں بارہا اپنی نظموں اور غزلوں میں پیش کی ہیں۔ مہمانِ اعزازی حاجی فہیم صدیقی (صوبائی صدر انڈین نیشنل لیگ) نے کہا کہ ملاّ کے تصورِ انسانیت کا سرچشمہ کوئی ایک مذہب یا اخلاقی ضابطہ یا فلسفہ نہیں اور سیاسی و معاشی نظریہ بھی نہیں ہے۔ ان کی فکر ان سب سے اپنی ذہنی غذا ضرور حاصل کرتی ہے۔ ان کا تصورِ انسانیت دراصل ایک فنکار کا تخلیقی تصور ہے جس کے نزدیک زندگی ایک جہدِ مسلسل ہے۔ سمینار کے مقالہ نگاران ڈاکٹر سیّد محمد صبیح ندوی، ڈاکٹر سیما صدیقی، ضیاء اللہ صدیقی، نکہت زہرا اور ڈاکٹر ارشاد بیاروی نے ان کی شخصیت اور ان کی شاعرانہ عظمت پر گفتگو کی۔ آخر میں صبیحہ سلطانہ اور ان کی صاحبزادیوں نے سبھی مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

## عالمی یومِ خواتین کے موقعے پر پروفیسر سیما صغیر کی کتاب 'تانیثیت اور اردو ادب: روایت، مسائل اور امکانات' کی رسمِ اجرا

علی گڑھ (9 مارچ)۔ عالمی یومِ خواتین کے موقعے پر انجمن محبانِ اردو علی گڑھ کے زیرِ اہتمام معروف ادیب، تنقید نگار اور مترجم ڈاکٹر سیما صغیر (سابق پروفیسر شعبۂ اردو اے ایم یو علی گڑھ) کی کتاب 'تانیثیت اور اردو ادب: روایت، مسائل اور امکانات' کی رسمِ اجرا معروف افسانہ نگار آصف اظہار علی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض جدید افسانہ نگار افشاں ملک نے انجام دیے۔ اس موقعے پر صاحبِ کتاب پروفیسر سیما صغیر کے ان خیالات پر روشنی ڈالی گئی کہ تانیثیت کی ابتدا ورجینا وولف کی تخلیقات میں دیکھنے کو ملتی ہے جس کا اثر دنیا کے ہر خطے میں نظر آتا ہے۔ اردو ادب میں بھی تانیثیت کے حوالے سے بہت سی خواتین ہیں جو اپنی نگارشات پیش کر رہی ہیں۔ ان کے یہاں اس سلسلے سے مختلف نظریات نظر آتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ خواتین کے ساتھ معاشی، سماجی، اقتصادی، سیاسی معاملات میں امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے۔ اس کتاب میں جہاں تانیثیت کے اصول پر روشنی ڈالی گئی ہے وہیں اس کے نظریات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو میں جو خواتین لکھ رہی ہیں ان کی تخلیقات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ کتاب اور صاحبِ کتاب پر گفتگو کرتے ہوئے پروگرام کی صدر آصف اظہار علی نے کہا کہ پروفیسر سیما صغیر عصرِ حاضر کی ایک اہم نقاد تھیں۔ نسائی ادب پر ان کی نگاہ نہایت عمیق تھی۔ مذکورہ کتاب میں انھوں نے تانیثیت کے حوالے سے جو بحث کی ہے وہ نہ صرف طلبہ و طالبات کے لیے مشعلِ راہ ہے بلکہ اساتذہ کے لیے بھی مفید ہے۔ افشاں ملک نے کہا کہ پروفیسر سیما صغیر متعدد کتابوں کی مصنفہ ہیں، ان کی علمی و ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے انھیں مختلف انعامات و اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ وہ ایک بے باک تنقید نگار رہی ہیں۔ ان کی کتاب 'تانیثیت اور اردو ادب' تانیثیت کو سمجھنے میں معاون ہوگی۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ پروفیسر سیما صغیر نے انتہائی مصروفیت کے باوجود نہایت محنت سے یہ کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب اردو ادب میں اضافے کا باعث ہے خصوصاً تانیثیت کو سمجھنے کے لیے یہ کتاب سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب میں نہایت مدلل انداز میں تانیثیت کے مفہوم و مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس کا مطالعہ اردو ادب کے چاہنے والوں کے لیے تانیثیت کی شناسائی کے لیے مددگار ثابت ہوگا۔ پروگرام میں عادل نواز، شہباز رحمٰن اور ذوالفقار زلفی نے بھی خطاب کیا۔ پروگرام میں شامل ہونے والوں میں غیاث الدین، اظہار علی، انعم فاطمہ، ثنا فاطمہ، ریشما طلعت، سلمٰی انصاری، جیوتی چودھری، سیما ملک، رفعت فاطمہ، زرّیں ناز، عذرا پروین، مشہود فاطمہ، پاکیزہ خاتون، نسرین فاطمہ، تسلیم زہرہ، صبا صدیقی، ذہین فاطمہ، انجم فاروقی، رفعت کاظمی، فرزانہ نقوی وغیرہ پیش پیش رہیں۔

## بہار کی علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کا رشتہ نہایت گہرا اور فطری ہے: پروفیسر اعجاز علی ارشد

### شعبۂ اردو پٹنہ کالج و قومی اردو کونسل کے باہمی اشتراک سے یک روزہ سمینار

پٹنہ (25 مارچ)۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبۂ اردو، پٹنہ کالج، پٹنہ کے باہمی اشتراک سے یک روزہ سمینار بعنوان 'بہار کی علاقائی زبانوں سے اردو کا رشتہ' پٹنہ کالج کے تاریخی سمینار ہال میں منعقد ہوا جس میں ماہرینِ ادب، اساتذہ، محققین اور طلبہ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت معروف ادیب و ناقد پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اردو زبان کو وسعت دینے کے لیے ہمیں عربی و فارسی کے ساتھ دیگر زبانوں سے بھی الفاظ اخذ کرنے چاہئیں۔ انھوں نے اردو کو محبت، سیاست اور انقلاب کی زبان قرار دیتے ہوئے کہا کہ بہار کی علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کا رشتہ نہایت گہرا اور فطری ہے، اور یہ رشتہ صدیوں کے لسانی و تہذیبی تعامل کا نتیجہ ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ عموماً اردو پر عربی و فارسی کے اثرات کی بات کی جاتی ہے، مگر علاقائی زبانوں کا اثر بھی اردو زبان پر اتنا ہی غیر معمولی ہے، اس لیے علاقائی زبانوں کے ساتھ اردو کے رشتے کو سمجھنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز مورخ پروفیسر امتیاز احمد (سابق ڈائرکٹر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری) نے کہا کہ بہار میں میتھلی، مگہی اور دیگر علاقائی زبانوں نے اردو کو مالا مال کیا ہے اور اردو نے بھی انھیں بہت کچھ دیا ہے۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر خالد انور (ممبر آف لجسلیٹو کونسل، بہار) نے کہا کہ زبانوں کے باہمی لین دین پر سنجیدہ گفتگو ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ زبانوں کو الگ تھلگ رکھ کر ترقی ممکن نہیں بلکہ کھلے ذہن کے ساتھ ہر زبان کے ادب کا استقبال کرنے کی ضرورت ہے۔

اس موقعے پر مہمانِ اعزازی پروفیسر انل کمار (پرنسپل، پٹنہ کالج)، مہمانِ اعزازی ڈاکٹر اظفر شمسی (ممبر، بہار اسٹیٹ مائنارٹی کمیشن و پرنسپل، ڈی ایس ایم کالج، جھاجھا) اور جناب پرمود کمار سنگھ (سب ایڈیٹر، دینک جاگرن) نے بھی خطاب کیا۔

افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شاداب شمیم نے کی، جب کہ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر نعمان قیصر نے پیش کیے اور کلماتِ تشکر ڈاکٹر بالمیکی رام نے ادا کیے۔

سمینار کا پہلا تکنیکی سیشن 'بھوجپوری اور انگیکا کا اردو سے رشتہ' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس کی صدارت جناب مشتاق احمد نوری نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ بہار کی زبانیں اپنی زرخیزی اور وسعت کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ انھوں نے بہار کی مختلف بولیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ تمام زبانیں اردو کے ساتھ مضبوط رشتہ رکھتی ہیں۔

مہمانِ اعزازی ڈاکٹر محمد احسن (ریجنل ڈائرکٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بھوپال) نے کہا کہ کسی بھی زبان کو زندہ رکھنے کے لیے اسے تعلیم سے جوڑنا ضروری ہے۔

اس سیشن میں ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، ڈاکٹر آفتاب احمد منیری، ڈاکٹر عبدالباسط حمیدی، ڈاکٹر منہاج الدین، ڈاکٹر شبنم پروین اور ڈاکٹر شبیر عالم نے مقالے پیش کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نعمان قیصر نے انجام دیے۔

دوسرا تکنیکی سیشن 'میتھلی اور مگہی کا اردو سے رشتہ' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر ابوبکر رضوی (رجسٹرار، پاٹلی پترا یونیورسٹی) نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ میتھلی اور مگہی جیسی زبانیں اردو کے لسانی سرمایے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ان کے باہمی تعلق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

اس موقعے پر مہمانِ اعزازی پروفیسر سورج دیو سنگھ (صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی) اور جناب محمد افضل (ممبر آف گورننگ کونسل، این سی پی یو ایل) نے بھی خطاب کیا۔

اس سیشن میں ڈاکٹر نثار فیضی، ڈاکٹر عطا عابدی، ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر اشہد کریم الفت اور ڈاکٹر نرجس فاطمہ نے مقالات پیش کیے۔ یہ سمینار مفید علمی و ادبی مباحث، مکالمے اور فکری تبادلے کے ساتھ کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا، جس نے اردو اور بہار کی علاقائی زبانوں کے باہمی رشتے کو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس موقعے پر صفِ سامعین میں سرکردہ ادیبوں اور ناقدوں کے علاوہ سامعین کی بڑی تعداد موجود تھی۔

## کروڑی مل کالج کے شعبۂ اردو میں نشستوں میں اضافہ

نئی دہلی (23 مارچ)۔ کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لیے یہ ایک نہایت خوش آئند اور تاریخی پیش رفت ہے کہ گریجویٹ سطح پر اردو مضمون کی نشستوں (Intake Capacity) میں نمایاں اضافہ کیا گیا ہے۔ آئندہ تعلیمی سال سے شعبۂ اردو میں داخلوں کی تعداد 23 سے بڑھا کر 40 کر دی گئی ہے۔ اس اہم فیصلے کو اردو زبان و ادب کے فروغ اور اس کی تعلیمی اہمیت کے اعتراف کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ نشستوں میں اضافے کا یہ مطالبہ گذشتہ کئی برسوں سے زیرِ غور تھا۔ اس کی منظوری سے نہ صرف اردو کے طلبہ و طالبات کے لیے اعلا تعلیم کے مزید مواقع فراہم ہوں گے بلکہ کروڑی مل کالج میں اردو زبان و ادب کی تدریسی، ادبی اور تحقیقی سرگرمیوں کو بھی نئی توانائی اور وسعت حاصل ہوگی۔ اس اقدام سے اردو میں دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کے لیے تعلیمی راستے مزید ہموار ہوں گے اور زبان و ادب کی روایت کو مضبوطی ملے گی۔ اس اہم کامیابی میں کالج کے معزز پرنسپل پروفیسر دنیش کھڑی کی سرپرستی اور رہنمائی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی مثبت سوچ، تعلیمی بصیرت اور ادارہ جاتی تعاون کے نتیجے میں شعبۂ اردو کی اس دیرینہ خواہش کو عملی شکل مل سکی۔ اس کے ساتھ ہی شعبۂ اردو کے اساتذہ کی مسلسل محنت، سنجیدہ کاوشوں اور تعلیمی سرگرمیوں نے بھی اس فیصلے کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس موقع پر شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر ندیم احمد نے کہا کہ شعبۂ اردو میں نشستوں میں اضافہ یقیناً ایک خوش آئند اور حوصلہ افزا فیصلہ ہے۔ اس سے اردو زبان و ادب میں دلچسپی رکھنے والے زیادہ سے زیادہ طلبہ کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کے مواقع میسر آئیں گے اور شعبہ اس عزم کا اعادہ کرتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی تدریس، تحقیق اور ترویج کے لیے اپنی کوششیں آئندہ بھی اسی سنجیدگی، خلوص اور علمی جذبے کے ساتھ جاری رکھے گا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

## ہمایا سمین کو پی ایچ. ڈی کی ڈگری تفویض

گورکھپور (15 مارچ)۔ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر ہمایا سمین کو ان کے تحقیقی مقالے 'اردو ناولوں میں تانیثی مسائل کی عکاسی' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ہمایا سمین نے اپنا مقالہ شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر محبوب حسن کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ہمایا سمین کی پی ایچ. ڈی کا وائیوا 14 مارچ کو آن لائن منعقد ہوا، جس میں پروفیسر عباس رضا نیر (صدر شعبۂ اُردو، لکھنؤ یونیورسٹی) بطورِ ممتحن شامل ہوئے۔ نگراں ڈاکٹر محبوب حسن نے موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے ممتحن پروفیسر عباس رضا نیر کا استقبال کیا۔ دوران وائیوا پروفیسر عباس رضا نیر نے مقالے کے حوالے سے کئی اہم سوالات کیے۔ ہمایا سمین نے نہایت سنجیدگی اور خود اعتمادی کے ساتھ سوالوں کے جوابات دیے۔ پروفیسر عباس رضا نیر نے ان کی تحقیقی کاوش کی ستائش کرتے ہوئے کہ مقالے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمایا سمین نے متن سے براہِ راست مکالمہ قائم کیا ہے۔ انھوں نے اردو کے اہم ناولوں کی روشنی میں تانیثی مسائل کی نشاندہی تحقیقی و تنقیدی انداز میں کی ہے۔ مقالہ قابلِ اشاعت ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ڈاکٹر محبوب حسن کی نگرانی میں لکھا گیا یہ مقالہ نئی فکشن کی جہتوں کو روشن کرے گا۔ سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد رضی الرحمٰن نے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور مبارکباد پیش کی اور کہا کہ مقالے کی زبان نہایت عمدہ اور خالص تحقیقی نوعیت کی ہے اور امید ظاہر کی کہ ہمایا سمین کا تحقیقی مقالہ شعبے کے دوسرے ریسرچ اسکالرز کے لیے سبق آموز ثابت ہوگا۔

(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

### اردو کی ممتاز فکشن نگار جیلانی بانو کے انتقال پر

## غالب انسٹی ٹیوٹ کا اظہار تعزیت

نئی دہلی (3 مارچ)۔ اردو ادب کی ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار جیلانی بانو کے انتقال کی خبر نے ادبی حلقوں کو سوگوار کر دیا ہے۔ اردو کے عالمی شہرت یافتہ ادارے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تعزیتی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا جیلانی بانو اردو فکشن کی اُن نمایاں شخصیات میں شمار ہوتی تھیں جنھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سماجی مسائل، عورت کے مقام، طبقاتی ناہمواری اور انسانی جذبات کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا۔ جیلانی بانو کی ادبی خدمات کئی دہائیوں پر محیط ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول اردو ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں نہ صرف معاشرتی جبر اور ناانصافی کو موضوع بنایا بلکہ عورت کی داخلی کشمکش اور خود شناسی کو بھی بڑی باریکی سے اجاگر کیا۔ ان کا اسلوب سادہ مگر پُراثر تھا، جس میں حقیقت نگاری اور فکری گہرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کا جانا پوری اردو دنیا کے لیے شدید صدمے کا باعث ہے۔ میں اپنی اور ادارے کی جانب سے ان کے تمام لواحقین کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہوں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا جیلانی بانو اردو کی صاحب اسلوب ادیبہ تھیں ان کی معروف تصانیف میں ناول 'ایوانِ غزل' کو خاص شہرت حاصل ہوئی، جسے ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔ اس کے علاوہ ان کے متعدد افسانوں کے مجموعے بھی شائع ہوئے جنھوں نے قارئین کے دلوں میں جگہ بنائی۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا، جن میں حکومتِ ہند کی جانب سے دیا جانے والا باوقار اعزاز پدم شری بھی شامل ہے۔ ان کے انتقال سے اردو ادب ایک عہد ساز قلم کار سے محروم ہو گیا ہے۔ ان کی وفات اردو فکشن کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

## قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی تنظیمِ نو جلد

نئی دہلی (26 مارچ)۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے حوالے سے مرکزی حکومت کی جانب سے باضابطہ جواب موصول ہو گیا ہے، جس سے اس ادارے کی تنظیمِ نو اور انتظامی سرگرمیوں کی بحالی کی امیدیں روشن ہو گئی ہیں۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر ڈاکٹر سیّد احمد خاں کو وزارتِ تعلیم کے تحت جو جواب موصول ہوا ہے اُس میں بتایا گیا ہے کہ کونسل کی تشکیلِ نو کا عمل جاری ہے اور متعلقہ کمیٹیوں کی تشکیل بھی زیرِ غور ہے۔ خط کے مطابق ایگزیکٹیو بورڈ اور گورننگ کونسل کی ازسرِ نو تشکیل کے لیے کارروائی آخری مراحل میں ہے جب کہ فائنانس کمیٹی کی تشکیل بھی وزارت میں زیرِ غور ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے کہا کہ مرکزی حکومت کی جانب سے جواب ملنا ایک مثبت اشارہ ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ این سی پی یو ایل کی تنظیمِ نو کا عمل جلد مکمل ہوگا اور ادارہ دوبارہ پوری فعالیت کے ساتھ اردو زبان کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کے فروغ کے لیے یہ ادارہ نہایت اہمیت کا حامل ہے، اور اس کی فعالیت میں تاخیر سے اردو سے وابستہ تعلیمی و ثقافتی سرگرمیاں متاثر ہو رہی تھیں۔ حکومت کی جانب سے پیش رفت کی یقین دہانی سے اردو طبقے میں امید کی نئی لہر پیدا ہوئی ہے۔ ذرائع کے مطابق این سی پی یو ایل کی تنظیمِ نو کے بعد تعلیمی پروگراموں، اشاعتی سرگرمیوں اور دیگر منصوبوں کو دوبارہ فعال کیا جائے گا جس سے اردو زبان کے فروغ کو نئی رفتار ملے گی۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

## تعلیمی پسماندگی کو ختم کرنے کے لیے سرسیّد کے مشن کو اپنانا ضروری

——— ایم. ڈبلیو. انصاری* (آئی پی ایس، ریٹائرڈ ڈی. جی)

سرسیّد احمد خان برِّصغیر کے اُن عظیم معماروں میں سے ہیں جنھوں نے ایک زوال پذیر قوم کو نہ صرف جگایا بلکہ اسے علم، شعور اور خود اعتمادی کی نئی راہ دکھائی۔ وہ محض ایک مصلح یا معلم نہیں تھے بلکہ ایک ایسی تحریک کے بانی تھے جس نے مسلمانوں کی تقدیر بدلنے کی بنیاد رکھی۔ ہر سال 17 اکتوبر کو ان کے یومِ پیدائش کی تقریبات بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہیں، علیگ برادری اپنے اسلاف پر فخر کا اظہار کرتی ہے، سیمینارز اور تقاریب کا انعقاد ہوتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے سرسیّد کے مشن کو بھی اسی سنجیدگی سے اپنایا ہے؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ جس طرح یومِ پیدائش پر علیگ برادری ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوتی ہے، اسی طرح یومِ وفات کے موقعے پر بھی اجتماعی طور پر ان کے لیے ایصالِ ثواب کیا جائے اور اس سے بڑھ کر ان کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ایک عملی اور مؤثر لائحۂ عمل تیار کیا جائے۔ آج کے حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ سرسیّد کو صرف یاد نہ کیا جائے بلکہ ان کی فکر کو زندہ رکھا جائے۔

مسلمانوں کی پسماندگی کا سب سے بڑا سبب تعلیمی عدم مساوات ہے۔ یہ کہنا کہ مسلمان تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتے، حقیقت کے برعکس ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ معیاری تعلیمی اداروں کی کمی، سرکاری اسکولوں کی ابتر حالت اور معاشی دشواریوں کے باعث ان کے لیے تعلیم کے مواقع محدود ہو گئے ہیں۔ روزگار کے میدان میں بھی انھیں خاطر خواہ مواقع میسر نہیں، جس کی وجہ سے مالی استحکام ایک خواب بن کر رہ گیا ہے۔ کاروباری دنیا میں سرمایہ اور سہولتوں کی کمی بھی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

سیاسی میدان میں کمزور نمائندگی نے بھی ان کے مسائل کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ پالیسی سازی میں مناسب حصہ داری نہ ہونے کے باعث ان کے مسائل اکثر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میڈیا کے ایک طبقے کی جانب سے مسلمانوں کی منفی تصویر کشی نے معاشرے میں غلط فہمیاں اور تعصّبات کو جنم دیا ہے، جس کا براہِ راست اثر ان کے حقوق اور مواقع پر پڑ رہا ہے۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم نے سرسیّد کو محض تقریبات اور نعروں تک محدود کر دیا ہے۔ کیا ہم نے کبھی ان کے یومِ وفات (27 مارچ) کو اسی عقیدت اور سنجیدگی سے منانے کی کوشش کی جس طرح یومِ پیدائش کو مناتے ہیں؟ یہ موقع محض تعزیتی الفاظ کا نہیں بلکہ احتساب اور عزمِ نو کا ہونا چاہیے۔ یہ سوچنے کا کہ ہم نے سرسیّد کے مشن کے ساتھ کتنا انصاف کیا ہے اور آئندہ کیا کرنا ہے اور ان کے تعلیمی مشن کو کیسے آگے بڑھایا جائے۔ آج بھی ہم تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہیں، اس لیے ان کے افکار، مشن اور تحریک کو آگے بڑھانا ہمارا اولین فریضہ ہے۔

ایسے حالات میں علیگ برادری کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سرسیّد کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھانا، نئے تعلیمی ادارے قائم کرنا، نوجوانوں کو جدید علوم اور ہنر سے آراستہ کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ہمیں صرف حکومتوں سے شکوہ کرنے کے بجائے خود اپنی ذمے داریوں کا احساس کرنے کی ضرورت ہے۔

سرسیّد کی زندگی کا خلاصہ یہی تھا کہ قوم کو تعلیم یافتہ، خود کفیل اور باوقار بنایا جائے۔ ان کے یومِ وفات (27 مارچ) کے موقعے پر ہمیں یہ عہد کرنا چاہیے کہ ہم تعلیم، تجارت، ہنر اور باہمی تعاون کے میدان میں سنجیدہ کوششیں کریں گے۔ ہر صوبے میں علی گڑھ طرز کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے، تاکہ علم کا چراغ ہر گھر تک پہنچ سکے۔

آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ سرسیّد احمد خان کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے کہ ہم ان کے مشن کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں۔ تعلیم کو عام کریں، شعور کو بیدار کریں اور ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کریں جو علم، انصاف اور مساوات پر قائم ہو اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سرسیّد کے افکار، مشن اور تحریک کو آگے بڑھایا جائے بلکہ پوری قوت و طاقت کے ساتھ یہ کام کیا جائے جس سے قوم کا کھویا ہوا وقار حاصل ہو۔ یہی سرسیّد کے خواب کی تعبیر ہے اور یہی ہمارے روشن مستقبل کی ضمانت بھی۔

* benazeeransar256@gmail.com

# گلدستوں کی اشاعت میں سخنورانِ اعظم گڑھ کا حصّہ

(بقیہ صفحہ 2 سے آگے)

شائع ہوا ہے۔ مولانا مبین کیفی چریاکوٹی کی غزل اسی میں شامل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ خواجہ عبدالمجید شیدا، سوہن لال شیفتہ، صغیر دہلوی، صفی لکھنوی، حافظ محمد ابراہیم دہلوی، ظریف لکھنوی وغیرہ متعدد نامور شعرا کا کلام شائع ہوا ہے۔

○ غنچۂ جاوید (بمبئی)

یہ ماہانہ گلدستہ جون 1906 میں تیلی گلی بھنڈی بازار بمبئی سے جاری ہوا۔ اس کے مدیر سید کاظم حسین ہدف تھے۔ بمبئی کے حمیدی پریس میں طبع ہوتا تھا اور ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو نکلتا تھا۔ اس کے سرورق پر یہ شعر لکھا ہوا ہے:

ہر گل جہاں میں گل امید ہوگیا
غنچہ ہر ایک غنچۂ جاوید ہوگیا

اس میں متعدد اہم شعرا کی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں حکیم سید یوسف حسین، اختر رضوی لکھنوی، غلام مصطفیٰ احقر، ہری پرشاد ذرہ وغیرہ کی طرحی اور غیر طرحی غزلیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 1913 تک کے مختلف شمارے راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ علامہ شبلی کی ایک فارسی غزل بھی اس گلدستے میں شائع ہوئی ہے۔

○ فصیح الملک (مارہرہ)

ماہنامہ فصیح الملک مارہرہ، نظم ونثر دو حصوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس کے مدیر نامور ادیب وشاعر احسن مارہروی تھے۔ اس میں اس دور کے تمام بڑے شعرا کا کلام شائع ہوا ہے۔ ان میں نوح ناروی، متین مچھلی شہری، راز لکھنوی، شاد میرٹھی وغیرہ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

○ گل چیں (لکھنؤ)

'گل چیں' ماہنامہ تھا۔ جنوری 1891 میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ اس کے مرتب ومہتمم محمد عسکری وسیم اردو کے ممتاز شاعر وادیب تھے۔ اس کے نگراں فضا وجگر صاحبان تھے۔ ایک سال بعد 1892 میں یہ گلدستہ گورکھپور منتقل ہوگیا اور نامور شاعر ریاض خیرآبادی کی نگرانی وسرپرستی میں 'ریاض الاخبار' پریس میں طبع ہونے لگا۔ اس دور میں اس نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ نامور شاعر امیر مینائی اور نواب میر محبوب علی خاں وغیرہ کے مصرعے طبع آزمائی کے لیے 'طرح' میں دیے جاتے تھے اور اس وقت کے شعرا ان طرحوں پر بھرپور دادِ سخن دیتے تھے۔ ان میں بہت سے نامور اور ممتاز شعرا شامل ہیں۔ اس کے سرورق پر یہ شعر ہمیشہ لکھا ہوتا تھا:

جہاں رکھا قدم اک دھوم مچ جاتی ہے گلشن میں
گلوں کی طرح بلبل ٹوٹتے ہیں دست گل چیں پر

'گل چیں' آخر میں لکھنؤ سے دوبارہ جاری ہوا مگر زیادہ دنوں تک دوبارہ بھی جاری نہ رہ سکا۔ اس کے باوجود شاعری کا مذاق پیدا کرنے میں لکھنؤ وگورکھپور کے اس گلدستے کا بڑا اہم حصہ ہے۔ افسوس اس کی صرف چند فائلیں ہی دستیاب ہوئیں۔

○ گلستانِ سخن (رنگون)

یہ گلدستہ اردو اکیڈمی رنگون برما سے شائع ہوا ہے۔ دراصل یہ رنگون برما میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں پیش کی جانے والی غزلوں، نظموں اور اس کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں چند اساطینِ اردو کا بھی تذکرہ شامل کیا گیا ہے۔ ایک مضمون میں برما میں اردو کی تاریخ اور اس عہد میں اس کی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ برما کے صدر اور وزیرِ اعظم کے وہ پیغامات بھی شامل کیے گئے ہیں جو انھوں نے اس مشاعرے کے سلسلے میں بھیجے تھے۔ پھر تمام شریک شعرا کا کلام ان کے مختصر تعارف کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ رنگون کے اس مشاعرے میں اعظم گڑھ کے متعدد ایسے شعرا نے شرکت کی جو وہیں آباد ہوگئے تھے اور اب ان کا ذکر بھی کہیں اور نہیں ملتا ہے۔ اس 'گلستانِ سخن' سے ان شعرا کا کلام خاص طور سے نقل کیا گیا ہے اور جو ہندستان میں پہلی بار منظرِ عام پر آرہا ہے۔

○ گلدستہ دامنِ بہار (آگرہ)

گلدستہ دامن بہار کی اشاعت کا آغاز کٹرہ حاجی حسن آگرہ سے جون 1892 میں ہوا۔ مالک ومہتمم فدا حسین تھے۔ 24 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس میں آگرے کے شعرا میں صادق اکبرآبادی، صدق اکبرآبادی، ٹھاکر پرشاد شاد اکبرآبادی اور دوسرے علاقوں کے ادبا وشعرا میں مسعود شفا غازی پوری، ایوب خاں صبر ردولوی، شیدا جونپوری وغیرہ کا کلام شائع ہوا ہے۔ طرحی اور غیر طرحی دونوں طرح کی غزلیں شامل ہیں۔ ان میں اعظم گڑھ کے بھی چند اہم شعرا کا کلام شامل ہے۔

○ محبوب الکلام (حیدرآباد)

مہاراجہ سرکشن پرساد شاد وزیرِ اعظم حیدرآباد دکن کی سرپرستی میں یہ گلدستہ 1899 میں جاری ہوا۔ اس کے کئی مدیر ہوئے۔ ابتدا میں جلیل مانک پوری (1946-1866) کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس میں خطۂ حیدرآباد کے تمام مشاہیر شعرا کا کلام شائع ہوا ہے۔ اس کا آغاز نواب میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد دکن کے کلام سے ہوتا تھا اور جو بڑے اہتمام سے شائع کیا جاتا تھا۔ پھر دیگر شعرا کا کلام ہوتا تھا۔ اس کے سرورق پر یہ شعر شائع ہوتا تھا:

قدر داں اے شاد اس کے ہیں شہ آصف نظام
گوہر تاج سخن ہوکیوں نہ محبوب الکلام

○ پیام یار (لکھنؤ)

24 صفحات پر مشتمل یہ گلدستہ ڈاک خانہ چوک لکھنؤ سے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ گلدستوں کی دنیا میں اسے بے پناہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، بلکہ اسے گلدستوں کا گلِ سرسبد کہنا چاہیے۔ یہ واقعہ ہے کہ 'پیام یار' لکھنؤ نے اردو شعر وشاعری کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس میں اعظم گڑھ کے متعدد شعرا کا کلام بہ کثرت شائع ہوا ہے۔

ماہنامہ 'پیام یار' محمد نثار حسین نثار کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ جون 1883 میں نکلا اور غالباً 1922 کے بعد بند ہوا۔ یہ شروع میں منشی گنگا پرساد ورما کے مطبع واقع امین آباد لکھنؤ میں طبع ہوتا تھا۔ بعد میں ایڈیٹر کے قومی پریس لکھنؤ میں چھپنے لگا۔ اس کے سرورق پر لالہ مادھو رام جوہر کا یہ شعر لکھا ہوتا تھا:

نالۂ بلبل شیدا تو سنا ہنس ہنس کر
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

'پیامِ یار' دو حصوں نظم ونثر پر مشتمل ہوتا تھا۔ ادبی وتنقیدی مضامین کے علاوہ مولوی عبدالحلیم شرر کے ناول بھی بالاقساط شائع ہوئے۔ مشمولات کے تنوع اور نوجوان شعرا کی حوصلہ افزائی کے سبب اس نے ہر حلقۂ شعر وادب میں اپنی جگہ بنالی تھی اور شہرت کے آسمان پر پہنچ گیا تھا۔

محمد نثار حسین نثار تاحیات اسے نکالتے رہے۔ 2 جنوری 1911 کو ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے منشی اکبر حسین نے ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ خود محمد نثار حسین نثار کو بھی تھا۔ انھوں نے لکھا ہے:

''آپ جانتے ہیں کہ 'پیام یار' نے اس بائیس تیئیس سال کی مدت میں آپ کے ملک، آپ کی زبان اور آپ کی قوم کی کیسی خدمت کی ہے۔ اس نے شاعری کو زندہ رکھا اور اردو شعرا کے مذاق کو ترقی دی۔ فی الحال بہت سے نوجوان ملیں گے جو اس پرانی شاعری کو برا کہتے ہیں مگر انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان کے اس تغیر پسند مجتہدانہ مذاق نے 'پیامِ یار' ہی کے آغوش میں پرورش پائی ہے اور اسی کو پڑھ پڑھ کے وہ اس قابل ہوئے کہ مفید یا غیر مفید اور مناسب یا غیر مناسب تغیر کے خواستگار ہوں، پیام یار نے ایسے ایسے مقامات میں شعر گوئی کا چرچا کر دیا جہاں اس سے پیشتر زبان اردو کا کوئی جاننے والا بھی کم تھا۔ بہت سے ایسے لوگ تھے جو موزوں کرنا بھی نہیں جانتے تھے۔ انھیں 'پیام یار' نے ابھارا بھار کے شاعر بنادیا۔'' (پیامِ یار، مارچ 1905)

مولانا حسرت موہانی جنھوں نے سب سے پہلے گلدستوں کی جانب توجہ کی اور ماہنامہ 'اردوے معلیٰ' میں ایک سلسلہ مضامین لکھا، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ انھوں نے بھی ماہنامہ 'پیام یار' کی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور لکھا ہے:

''پیام یار اردو زبان کے قدیم گلدستوں میں اگرچہ سب سے پرانا ہے مگر ایک حیثیت سے اس کا مقابلہ اور کوئی دوسرا رسالہ یا گلدستہ نہیں کرسکتا کہ یہ وقت اجرا سے آج تک عارضی تعویق سے قطع نظر کرکے اس کی اشاعت کبھی موقوف نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ منشی نثار حسین مرحوم ایڈیٹر پیام یار اردو کے سب سے پرانے خادم تھے۔''
(اردوے معلیٰ، مئی 1912)

منشی نثار حسین اور ان کے گلدستہ 'پیام یار' کی ادبی خدمات کا اعتراف ان کے دوست نامور اہلِ قلم، ادیب و ناول نگار اور ماہنامہ 'دلگداز' لکھنؤ کے مدیر مولوی عبدالحلیم شرر نے بھی کیا ہے۔ اسی طرح دبیر اکبرآبادی مدیر 'زبان' دہلی نے بھی محمد نثار حسین نثار اور ان کے گلدستہ ماہنامہ 'پیام یار' کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ غالباً اسی شہرتِ عام کے سبب سخنورانِ اعظم گڑھ نے اس سے زیادہ دلچسپی لی اور ان کا کلام بھی سب سے زیادہ 'پیامِ یار' لکھنؤ ہی میں شائع ہوا ہے۔

شعرائے اعظم گڑھ کی یہ داستانِ شعر وادب جو گلدستوں میں محفوظ ہے، تاریخِ اعظم گڑھ کا بڑا خوب صورت باب ہے اور اس قدر خوب صورت باب ہے کہ اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

---

شائستہ منزل، 641، پورہ غلامی، عقب آواس وکاس، اعظم گڑھ-276001، یوپی
E-mail: azmi408@gmail.com
Mob. 9838573645

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

# ونود کمار ترٹھی بشرؔ کی نظم گوئی...

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

پر یہ دنیا ہے، یہاں کس نے کسے بخشا ہے
وقت تو تند گریزاں ہے، کہاں ٹھہرا ہے
کل ہمیشہ سے ہی نادیدہ تھا، نادیدہ ہے
وقت کوئی بھی ہو یکساں تو نہیں ہوسکتا

## عصری آگہی اور سماجی مسائل:

بشرؔ نے اپنے عہد کی تلخ حقیقتوں، انسان کے اندر بڑھتی ہوئی مادیت پرستی، اور اخلاقی گراوٹ کو بھی اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔ وہ ایک بیدار شہری کی طرح اپنے معاشرے کی خامیوں اور تضادات پر نظر رکھتے ہیں۔ نظم 'کثافت' سے یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

اب کے پتھر اُگیں گے کھیتوں میں
یہ زمیں اب کے سوکھ جائے گی
اب کے بے آب ہوگا ہر دریا
تشنگی حد کے پار جائے گی
اب کے بارش میں اولے برسیں گے
اب کوئی فصل اگ نہ پائے گی
اب کے بہنی ہے برف جیسی ہوا
روح اس بار بچ نہ پائے گی
دیکھیے اب کے ہوتا ہے کیا کیا
جان لگتا ہے اب کے جائے گی

یا نظم 'دشواریاں' سے یہ سطریں:

اے خدا! کچھ دیر انساں بن کے دیکھ
مشکل و دشوار ہے کتنی حیات
کشمکش میں بیتتی ہے زندگی
کتنے دوراہوں کی ہے یہ کائنات
منزلیں چنتا ہوں، جو اپنے لیے
کیوں نہیں بھاتیں وہ اگلے دن مجھے
دل ہے غم آلود کیوں ہر پل مرا
کر رہے خدشات کیوں بے دم مجھے
یہ جہاں کیسا بنایا تو نے رب
سانس لینے میں ہے کتنی مشکلات
اے خدا! کچھ دیر انساں بن کے دیکھ
مشکل و دشوار ہے کتنی حیات

## جذباتی اور رومانوی آہنگ:

محبت، تنہائی، اور فطرت کی خوب صورتی بھی ان کی نظموں میں ایک نمایاں رنگ بھرتی ہے۔ تاہم، ان کا رومانویت کا انداز سطحی نہیں، بلکہ اس میں فلسفیانہ اداسی اور وجودی سوالات کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ بشر کا فن یہاں اپنے عروج پر ہے۔ الفاظ گویا کاغذ پر سلگ رہے ہیں۔ نظم 'بندش' میں اس سلگتی آنچ کو محسوس کیجیے:

ابھی بجھے ہیں چراغ روشن
یہ چاندنی دھوپ بن رہی ہے
ہوئی ہوا آغازِ صبح جیسے
یہ نیم شب دن میں ڈھل رہی ہے
مگر مرے تشنہ لب پہ اب بھی
خمار و آتش سلگ رہی ہے
ابھی تلک دھڑکنیں جواں ہیں
ابھی بھی رفتارِ رگ وہی ہے
ابھی بھی ہے جسم و جان پرنم
ابھی ابھی اٹھ کے وہ گئی ہے

یا 'اشتہا' میں شوقِ طلب اور جذبات کا یہ تلاطم:

آ کہ میں روح سے چھولوں تجھ کو
میری پلکیں ہوں شبستان تری
عشق سے چھولوں تری چشم و جبیں
آ کہ ہو جاؤں محبت تیری
آ کہ سرگم سا بجوں دل میں ترے
درمیاں فرق مٹا دوں سارے
آ کہ گیسو میں سواروں تیرے
گوندھ دوں بالوں میں اختر سارے
جسم پر تیرے رکھوں گرم بدن
تیرے ہونٹوں پہ سویرا کر دوں
میں سمٹ جاؤں ترے پیکر میں
تیرے ساگر پہ سفینہ رکھ دوں

## لہجے کی انفرادیت اور تخلیقی آواز

بشرؔ کا لہجہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی انفرادیت ہے۔ یہ لہجہ صرف جذباتی نہیں، بلکہ اس میں دانشمندی، خود احتسابی اور ایک منفرد کرب بھی شامل ہے۔ وہ کسی کی نقالی نہیں کرتے بلکہ ان کی نظموں میں ایک اپنی ذاتی آواز سنائی دیتی ہے، جو ایک خاص 'خود رو' (خود سے اگنے والے) انداز کو جنم دیتی ہے۔

نظم 'وہ کون ہے' میں بشرؔ نے کیا کمال کے سمعی اور بصری پیکر تراشے ہیں، دیکھیے:

ٹپک ٹپک کر جو سر سے میرے
گری ہیں صفحے پہ چند بوندیں
وہ خوں ہے میرا جو آب بن کر
بدن کی آتش بجھا رہا ہے
ہے یہ تصور میں کون میرے
جو مجھ پہ دن رات چھا رہا ہے
میں اس تخیل میں گم ہوں، جیسے
کہ چاند ہاتھوں میں آ گیا ہے
مزاج رت شبنمی ہوا ہے
جبیں پہ جگنو چمک رہا ہے
ہے کون جو مثلِ نور بن کر
درخشاں ظلمت کو کر گیا ہے
زمیں پہ چمکے ہیں ماہ و اختر
وہ جیسے سج دھج کے آ رہا ہے

یا پھر نظم 'روشنی' کی یہ صناعی بھی اپنی مثال آپ ہے:

روشنی یہ کہاں سے آتی ہے
شمع کوئی، کہاں کوئی جگنو
کوئی اختر نہ ماہ و مہر کوئی
لفظِ الفت سے روحِ دل پہ مرے
کچھ لکیریں سی کھینچتا ہے کوئی
جن میں قسمت، نہ مائلِ امید
جن سے کچھ بھی عیاں نہیں ہوتا
ایسے طوفان اٹھ رہے ہیں آج
جن میں کل کا پتہ نہیں ہوتا
نور سی مجھ پہ بچھ رہی ہے کون
جس میں کوئی رواں نہیں ہوتا
ایک بچے سی مسکراتی ہے
دور سے ہاتھ بس ہلاتی ہے
روشنی یہ کہاں سے آتی ہے

ونود کمار ترپاٹھی بشرؔ کی نظم نگاری ایک متوازن اور بامقصد شاعری کی مثال ہے۔ وہ نہ صرف اردو شاعری کے روایتی حسن کو برقرار رکھتے ہیں بلکہ جدید حسیت اور نئے فکری رجحانات کو بھی بخوبی سموتے ہیں۔ ان کی نظمیں ایک طرف قاری کے دل کو چھوتی ہیں تو دوسری طرف اس کے ذہن کو غور و فکر کی دعوت بھی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری، بالخصوص نظم نگاری، یہ ثابت کرتی ہے کہ کسی بھی تخلیقی عمل کی کامیابی کا انحصار محض نئے رجحانات کی تقلید میں نہیں، بلکہ اپنے ماضی کی جڑوں سے جڑے رہنے اور اپنے عہد کے تقاضوں کو فنکارانہ دیانت داری سے پورا کرنے میں ہے۔ بشرؔ کی نظمیں ہمیں ایک ایسا شاعر دیتی ہیں جو اپنے تجربات، مشاہدات اور تخیل کو فن کی کسوٹی پر پرکھ کر پیش کرنے کا ہنر خوب جانتا ہے۔

1/406, Mubarak Tower, V.B. Nagar
Near LIG Colony, Kurla (W), Mumbai-400070
Mob. No.: 7738451200


## انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

| | | |
|---|---|---|
| میرے مضامین (مجموعۂ مضامین و مقالات) | ڈاکٹر ماجد دیوبندی | 300/- |
| نسخۂ حفیظ الدین احمد | اطہر فاروقی | 1000/- |
| سرودِ عشق | شاہ رُخ جمال | 200/- |
| گل دوگانہ | سیّد کاشف رضا | 300/- |
| مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ | پروفیسر شریف حسین قاسمی | 700/- |
| مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں) | خلیق احمد نظامی | 4500/- |
| نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ) | معصوم مرادآبادی | 250/- |
| ہمارا شہر اُس برس (گیتا نجلی شری) | ترجمہ: آفتاب احمد | 700/- |
| میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا | سرور الہدیٰ | 500/- |
| 1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں | شمس الاسلام | 300/- |
| دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال) | مترجم: سیّد وجاہت مظہر | 500/- |
| غزل اور فنِ غزل | ڈاکٹر نریش | 200/- |
| فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ | سیّد رضوان علی ندوی | |
| | رؤف پاریکھ | 250/- |
| مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام | ابراہیم افسر | 600/- |
| منیب الرحمٰن کی ایک صدی | بیدار بخت/ انور احمد | 400/- |
| اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر | رؤف پاریکھ | 300/- |
| رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟ | ڈاکٹر شمس بدایونی | 300/- |
| غروبِ شہر کا وقت | اُسامہ صدیق | 900/- |
| کچھ اُداس نظمیں | ہربنس کھیا | 300/- |
| میانِ من و تو (تحقیقی و تنقیدی مضامین) | پروفیسر شاہد کمال | 500/- |
| میرا جنون اردو (خطبات و مضامین) | طاہر محمود | 700/- |
| میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی) | صدف فاطمہ | 400/- |
| کلّیاتِ خطباتِ شبلی | ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 400/- |
| آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ | ڈاکٹر بشیر بدر | 500/- |
| اداریے (مشفق خواجہ) | محمد صابر | 500/- |
| انور عظیم کی ادبی کائنات | فیضان الحق | 700/- |
| بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں) | غلام حیدر | 2400/- |
| تحقیق و توازن | ڈاکٹر نریش | 250/- |
| تحقیقی مباحث | رؤف پاریکھ | 300/- |

# ونود کمار ترپاٹھی بشرؔ کی نظم گوئی

## روایت اور جدیدیت کے سنگم پر

عبداللہ ذکریا ندیم

ادبی ناقدین کا ایک معتبر حلقہ اب اس حقیقت کا برملا اظہار کر رہا ہے کہ سخن کے آسمان پر اب نظم کا ستارہ پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے، جب کہ غزل اپنے فنی سفر کی انتہا کو چھو کر اب ایک ایسے مقام پر کھڑی ہے جہاں موضوعات کی مزید گنجائش بمشکل ہی دکھائی دیتی ہے۔ غزل کے پیمانے میں جو کچھ انڈیلا جانا تھا، وہ صدیوں پہلے انڈیلا جا چکا۔ یہاں تک کہ اقبال اور فیض جیسے اساطینِ ادب نے بھی اس باریک نکتے کو پا لیا تھا کہ غالب نے غزل کو جس معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے، اس سے آگے قدم بڑھانا یا اُس سحر سے نکلنا تقریباً ناممکن ہے؛ چناں چہ انھوں نے اپنے فکری وفور اور فلسفیانہ گہرائی کے لیے نظم کی پناہ لی۔ درحقیقت، غزل کی دو مصرعوں میں قید اور ردیف و قافیے کی سخت بندشیں اکثر خیال کے تسلسل کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں، اس کے برعکس نظم کا کینوس ایک بے کنار سمندر کی طرح وسیع اور عمیق ہے۔ یہ صنفِ سخن شاعر کو یہ آزادی عطا کرتی ہے کہ وہ کائنات کے لامتناہی مسائل سے لے کر ذات کے لطیف ترین گوشوں تک ہر جذبے کو مکمل جزئیات اور تسلسل کے ساتھ بیان کر سکے۔ غالباً یہی وہ شعوری احساس اور فنی بصیرت تھی جس نے بشر صاحب کو بھی نظم کی طرف راغب کیا تا کہ وہ اپنے جذبات و احساسات کی مصوری کسی بندش کے بغیر، پوری صداقت اور فنی رچاؤ کے ساتھ کر سکیں۔

ونود کمار ترپاٹھی بشرؔ کی نظم گوئی اردو شاعری کے جدید منظر نامے پر ایک غیر معمولی نقش ہے۔ ان کی نظمیں صرف جذبات کی ترسیل تک محدود نہیں ہیں، بلکہ وجودی سوالات، فلسفیانہ ژرف نگاہی اور فنی اختراع کا سنگم ہیں۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے عصری کرب کو روایتی آہنگ میں گوندھ کر ایک نئی جمالیات تشکیل دیتے ہیں۔

بشرؔ کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے اردو شاعری کو ایک نئی وسعت اور گہرائی عطا کی ہے۔ ان کی نظم نگاری محض فنی چابک دستی کا مظاہرہ نہیں ہے، بلکہ یہ زندگی کے گہرے مشاہدے، سماجی شعور اور روحانی تلاش کا ایک بھرپور اظہار ہے۔ وہ اپنی نظموں میں روایت اور جدیدیت کے عناصر کو اس طرح ہم آمیز کرتے ہیں کہ قاری کو ایک منفرد جمالیاتی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔

### فکری کینوس کی وسعت اور موضوعاتی تنوع:

بشرؔ کی نظم گوئی کی سب سے اہم خصوصیت ان کا فکری کینوس ہے۔ وہ صرف ایک مخصوص موضوع یا جذبے تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان کی نظمیں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو محیط ہیں۔ مجموعے کی پہلی نظم 'اضطراب' سے کچھ بند ملاحظہ فرمائیں:

یہ تیرے جاتے ہی کیا ہوا ہے
یہ بحثِ بود و نبود کیا ہے
اس اضطرابِ نظر نے دیکھے
ہیں منظرِ دہر کیسے کیسے
نہ رنگ و خوشبو، نہ گلشن و گل
ہیں بستیاں بھی مزار جیسی
نہ تابِ آتش، نہ خنک سردی
فضا سے رعنائی ختم سی ہے
تھکی تھکی سی ہیں صبح و شام اب
شبِ مسرت تبہ ہوئی ہے
نہ چہچہاہٹ ہے اب شجر پر
نہ منتظر اب ہے کوئی چھت پر
یہ نیم جاں شمع بجھ رہی ہے
نہ کوئی آواز آ رہی ہے
ہے بے امیدی سی اس جہاں سے
ہو چین حاصل مجھے کہاں سے
یہ تیرے جاتے ہی کیا ہوا ہے

کہاں یہ افسردگی اور آزردگی اور کہاں 'آمد' میں کیف و انبساط اور سرخوشی کا یہ عالم:

**آمد**

یہ خواہشِ دید و وصل و قربت
یہ جستجوئے شبِ مسرت
رگوں میں سیلابِ خوں کا بہنا
غبارِ رہ کا بہار بننا
کس آس پر آنکھ ٹک گئی ہے
زمین شبنم سے دھل گئی ہے
مرے تصور کی کوکھ میں اک
خیال مہتاب پل رہا ہے
یہ کس کی آمد کی اطلاع ہے
ہے کون جو پاس آ رہا ہے
ہے انتظارِ وصل کس کا
جو مجھ کو گلزار کر رہا ہے
رگوں میں گلشن کھلا رہا ہے
معمۂ زندگی ہے کیسا
یہ ذہن جس سے الجھ رہا ہے
یہ کون خوشیوں سا ہنس رہا ہے
یہ کون خوشبو سا گھل رہا ہے

### روحانی اور باطنی تلاش:

ان کی کئی نظمیں باطن کی سیر اور روحانی کرب و سکون کو موضوع بناتی ہیں۔ وہ صرف خارجی دنیا کے شور و غل کو نہیں سنتے بلکہ 'میں کون ہوں' اور 'کائنات کا مقصد کیا ہے' جیسے بنیادی سوالات سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ نظم ''ادراک'' سے کچھ بند دیکھیں:

برق کی برہم لکیریں
بادلوں پر کھنچ رہی تھیں
ہر طرف مبہم نظارے
ہر طرف تاریکیاں تھیں
شور اٹھتا تھا یوں جیسے
آج ہے جو کل نہ ہوگا
اک تباہی کے سوا اب
دوسرا منظر نہ ہوگا
ہر طرف سیلاب ہوگا
اب کہیں کوئی نہ ہوگا
اب کہاں کچھ بھی بچے گا

نظم 'وقت' سے یہ بند بھی دیکھیں:

وقت کوئی بھی ہو یکساں تو نہیں ہو سکتا
اختر و ماہ و گلابوں سے سجا لو چاہے
اونچی دیواروں میں محفوظ بنا لو چاہے
دولتِ دہر، مکاں چاہے بنا لو جتنے
ہو نگہبان و محافظ ترے چاہے جتنے

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاونِ مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق
Assisistant Editors : Munawwar Hasan Kamal
Salim Farooq
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***